نقطۂ نظر

ساجد حمید

ارتقاے حیات اور قرآن مجید

(۱)

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نوٹ: اس مضمون کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں آیات کے فہم کو بیان کیا گیا ہے، اور دوسرے حصے میں احباب کی طرف سے اس پر وارد اعتراضات وسوالات کا جواب دیا گیا ہے۔

یہ مضمون، نظریۂ ارتقا(evolution of species) کے اثرات سے بلند رہ کر،[۱] آیات قرآنی کے کلام الٰہی کی روشنی میں مطالعہ کی ایک کوشش ہے۔ یہ اس خیال سے لکھا جا رہا ہے کہ اہل علم اس پر غور کریں اور اس لیے بھی کہ اگر میرا فہم درست ہے تو قرآن کا نظریۂ تخلیق متعارف ہو۔ میری کوشش اس میں بس یہ ہے کہ تمام اہم نکات سامنے آ جائیں اور میں کلام الٰہی کے —— اپنی دانست میں اس کے الفاظ اور آیات کے سیاق و سباق کے قریب تر —— مفاہیم قارئین تک پہنچا دوں۔ ممکن ہے، کل سائنس بھی اسی نظریۂ تک پہنچے۔ یہ مضمون نہ کسی پر تنقید ہے اور نہ کسی کی تائید۔ محض غذاے فکر (food for thought) کے طور پر پیش کر رہا ہوں، کیونکہ اس موضوع پر بلند قامت جید علما کی تحقیقات موجود ہیں۔ آیات کا ایک فہم مجھے آمادۂ گفتگو کر رہا ہے، محض تاب سخن مجھے جرأت آموز نہیں ہے۔

۱۔ اس پر ایک توضیحی نوٹ ''بنیادی باتیں'' کے عنوان کے تحت آگے آ رہا ہے۔

قرآن اور ارتقا

بنیادی باتیں

میں نے اس مضمون کا آغاز اس جملے سے کیا ہے: "یہ مضمون، نظریۂ ارتقا(evolution of species) کے اثرات سے بلند رہ کر"، لکھا جا رہا ہے۔ نظریۂ ارتقا سائنس کی نظر میں پختہ علم کے دائرے میں آتا ہے، اس لیے میرا یہ جملہ یہ تاثر دے سکتا ہے کہ میں ایک ثابت شدہ حقیقت سے گریز کر رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ فہم قرآن میں پختہ علم کا استعمال ممنوع نہیں، بلکہ مطلوب ہے، لیکن پختہ ترین علم بھی، اگر قرآن کے الفاظ متحمل نہ ہوں، تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس اصول کی اصل وجہ قرآن سے عقیدت نہیں، بلکہ انسانی علوم کی حقیقت ہے۔[۲] انسانی علوم پختہ قرار پا جانے کے باوجود غیر پختہ ثابت ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً دور متوسط کی بدیہات اور عقلی قطعیات اب کہیں دیکھنے کو بھی نہیں ملتیں۔ وہ اس طرح فوت ہوئیں کہ ان کا جنازہ بھی ادا نہیں کیا گیا۔

موضوع پر آنے سے پہلے، ایک اور بنیادی بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ سات آسمان، گردش شمس و قمر، ارتقائے حیات، مراحل جنین یا آغاز حیات قرآن کے موضوعات نہیں ہیں۔ قرآن مجید خدا کی صناعی، اس کی قدرت تخلیق وصحت تخمین اور حکمت و رحمت کے بیان کے وقت یا توحید و معاد وغیرہ پر استدلال کے وقت مظاہر کائنات سے متعلق بعض بیانات دے دیتا ہے۔ ان بیانات سے دعوتی، تذکیری یا استشہادی لب و لہجے میں کچھ معلومات ہمیں فراہم ہو جاتی ہیں۔ یہ سب غیر سائنسی طرز کلام میں بیان ہوتی ہیں، اس لیے کہ قرآن اصلاً سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ وہ سائنسی اسلوب میں بات کرے، کیونکہ وہ کتاب ہدایت ہے، اسے ہدایت کے سمجھانے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کے ایک شعر سے مثال دیتا ہوں، جو انھوں نے ذرے(atom) کے بارے میں جدید معلومات کی روشنی میں کہا تھا۔ معلوم بات ہے کہ شعری اسلوب سائنسی پیرایۂ بیان سے مختلف ہوتا ہے۔ اس سے آپ سمجھ سکیں گے کہ سائنسی حقائق ادب میں کیسے بیان ہوتے ہیں، اور اقبال جیسا

۲۔ اس مضمون کے علاوہ، جس کا آپ اس وقت مطالعہ فرما رہے ہیں، ایک اور مضمون میں نے لکھا ہے۔ میں نے اُس میں نظریۂ ارتقا کا علم (epistemology) کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون میں نظریۂ ارتقا کی علمی حیثیت کا تعین اور انکار خدا کے لیے اس سے کیے گئے استدلال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سائنس کی رو سے قرآن کے نظریۂ تخلیق پر پیدا ہونے والے سوالات کا جواب بھی ہے۔ جابجا مختصراً نظریۂ علم بھی زیر بحث آ گیا ہے۔ بہ توفیق الٰہی فرصت ملتے ہی نظر ثانی کے بعد جلد طبع ہو جائے گا۔ وما توفیقي إلا باللّٰہ۔

قادر الکلام شاعر بھی سائنسی طرز بیان کے اعتبار سے کس قدر ناکام رہتا ہے۔ فرماتے ہیں:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرے کا دل چیریں

اس شعر پر بہت سے سائنسی اعتراضات ہو سکتے ہیں، مثلاً نوری شے، یعنی فوٹان وغیرہ میں وہ توانائی نہیں ہوتی جو پورے ایٹم میں ہوتی ہے۔ اسی طرح نہ سورج کا لہو ٹپکتا ہے اور نہ ذرے کا، اور نہ کسی ذرے کا دل ہی ہوتا ہے۔ جو اس شعر کو اس نظر سے دیکھنے لگے، تو اس پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ وہ شعر کو بہ حیثیت شعر نہیں دیکھ رہا۔ یہ کسی سائنس دان کا اپنے سائنس کے مضمون میں لکھا ہوا جملہ نہیں ہے۔ اسے شعر کے طور پر ہی دیکھا جائے گا۔ اس اعتبار سے یہ ایک اچھا شعر ہے۔

اس مثال سے مجھے صرف یہ واضح کرنا ہے کہ شاعرانہ پیرایے میں ایک سائنسی حقیقت کو کیسے بیان کیا گیا ہے، وہ یقیناً واضح ہو گیا ہوگا۔ اسی پر آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ قرآن جیسی دعوتی و اصلاحی کتاب میں، خدا کی قدرتوں و حکمتوں، اس کی تخلیق کی رعنائیوں و معنی خیزیوں کے بیان کے لیے، استدلال کو فطرت کے قریب رکھنے کے لیے اور اس کے اولین مخاطب کو مظاہر کے حقیقی و ظاہری تفاوت میں الجھائے بغیر[3] حقائق دعوتی پیرایۂ بیان میں کیسے بیان ہوئے ہوں گے۔

لٰہذا، میرے فہم کے مطابق، قرآن مجید میں فراہم کی گئی معلومات پیغام رسانی کے لیے بہ طور مثال و استدلال آئی ہیں۔ ان میں اس بات سے گریز کیا گیا ہے کہ مظاہر کون و حیات کے مخفی حقائق کو چھیڑا جائے، لیکن قرآن میں ایک معجزانہ سطح کی خوبی موجود ہے کہ مظاہر کو جب بھی بیان کیا گیا ہے، تو بیان حقائق میں ایسی غلطی نہیں ہوئی کہ جو اُس زمانے کا ایک عرب کر سکتا تھا۔ مثلاً پورا قرآن مجید خالی ہے کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے

۳۔ مثلاً اگر اللہ تعالیٰ یہ بیان دے دیتے کہ زمین گردش کر رہی ہے، تو عربوں نے شرک و توحید پر تو بات نہیں کرنی تھی، اس طرح کی باتوں کو ہدف بنا کر قرآن کے کتاب حکیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول کریم ہونے پر شبہات اٹھا دینے تھے، اس لیے قرآن ان مظاہر کی حقیقت واشگاف نہیں کرتا، البتہ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ غلط بات بھی نہیں کہتا۔ مثلاً اس نے اس زمانے کے مسلمہ علم کے مطابق زمین کو ساکن یا چپٹا نہیں کہا، چاند کو سراج (چراغ) نہیں کہا، انھیں ایتھر میں تیرتے ہوئے نہیں کہا، وغیرہ۔

گرد گھومتا ہے، حالاں کہ یہ بات کہنے کے بے شمار مواقع قرآن مجید میں موجود ہیں۔

لٰہذا، اس پیرائے میں قرآن مجید مظاہر فطرت کو بیان کرتا ہے۔ ان میں جو معلومات دینے والی آیات ہیں، ان سے ہم علم اخذ کرتے ہیں۔ مثلاً اللہ نے زمین و آسمان چھ دنوں میں بنائے اور سات آسمان بنائے گئے ہیں وغیرہ۔ اب یہ باتیں محض مثالیں نہیں ہیں۔ ان میں ایسی اطلاعات ہمیں دی گئی ہیں جو ابھی تک سائنسی رنگ میں ناقابل فہم ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ یہ ہی حق ہیں۔ اب اصل موضوع پر آتے ہیں۔

آیات تخلیق آدم کا محل

تخلیق حیات اور تخلیق آدم کی آیات کا محل بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ زیادہ تر آیات آخرت میں حیات بعد الموت کے استبعاد (improbability) کو رد کرنے کے لیے ہیں۔ نفس واحدہ جو تمام بنی نوع آدم کا باپ ہے، اس کی اور اس کے جوڑے کی تخلیق کے بارے میں سورۂ نساء کی پہلی آیت نوع انسانی کی وحدت بتانے کے لیے ہے کہ سب ایک اللہ کی مخلوق اور نفس واحدہ کا کنبہ ہیں۔ آل عمران کی وہ آیت جس میں حضرت عیسیٰ کو مثیل آدم قرار دیا گیا ہے وہ سیدنا مسیح کے ابن اللہ ہونے کے عقیدہ کے رد میں آئی ہے، اس لیے ان میں کسی آیت کا اصل موضوع نہ تخلیق آدم ہے اور نہ رد و ثبوت ارتقا ہے۔

میرے فہم کے مطابق، قرآن مجید ارتقا[۴] کے نظریے کو رد کرتا ہے، یہ بات بھی سائنسی معنی میں نہیں ہے، بلکہ قرآن کی کہی ہوئی باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ رد ارتقا والی میری یہ راے صرف انسانی تخلیق سے متعلق ہے۔ انسان سے پہلے اور بعد میں جتنے جان دار پیدا ہوئے، وہ ارتقا سے ہوئے یا نہیں، قرآن خاموش ہے۔ البتہ یہ بات قرین قیاس ہے کہ تمام مخلوقات اسی طرح سے پیدا کی گئی ہوں، جیسے انسان بنائے گئے، میرا ذاتی رجحان اسی طرف ہے، لیکن قرآن کے خاموش ہونے کی وجہ سے یہ محض رجحان ہی ہے۔

آیئے، اب ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس موضوع سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہیں:

۴۔ ارتقا سے میری مراد یہ ہے کہ زندگی یک خلوی جان دار سے شروع ہوئی اور ترقی کرتے کرتے انسان جیسی اعلیٰ مخلوق تک پہنچی، یوں کہ دیگر تمام مخلوقات انسان کی رشتہ دار ہیں، اور ان میں سے کچھ اس کے اب وجد (ancestors) ہیں، جو سب ایک ہی باپ (common ancestor) سے پیدا ہوئے ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پہلی آیت

تخلیق آدم

سب سے پہلے ہم ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں آدم علیہ السلام کی تخلیق کا —— پہلے انسان کی حیثیت سے —— ذکر ہوا ہے۔ ایسی آیات کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ یہ آیات یہ بتاتی ہیں کہ پہلا انسان کیسے وجود میں آیا۔ اس لیے یہ آیات اصولی آیات قرار پاتی ہیں۔ باقی آیات جو انسانی تخلیق کی عموم میں (generally) بات کرتی ہیں، عموم میں ہونے کی وجہ سے اصولی حیثیت اختیار نہیں کر سکتیں۔ ان میں، بالخصوص پہلے انسان کی تخلیق پیش نظر نہیں ہے، بلکہ انسانوں کی تخلیق کا عمومی بیان ہے، اس لیے ان تمام آیات کو تخلیق آدم والی آیات کی روشنی میں سمجھا جائے گا، کیونکہ حضرت آدم، یعنی پہلے انسان کی تخلیق اس معاملے کی کنجی ہے کہ انسان کیسے تخلیق ہوا۔ اسی کے مراحل تخلیق ہمارے لیے رہنما ہوں گے۔ لہٰذا آیات قرآنی کا وہ مطالعہ سوء فہم کا باعث ہوگا جس میں انسان کی عمومی تخلیق والی آیات کو مرکزی یا اصولی جگہ دے دی جائے۔

یہ بات توجہ میں رہے کہ میں اپنے فہم کے ثبوت کے لیے آیات کے تحت کوئی لسانی بحث نہیں کر رہا ہوں، اس لیے کہ میں انھیں اسی معنی میں لے رہا ہوں جس میں یہ آیات صدیوں سے لی جا رہی ہیں۔ اس لیے مجھے اس پر کوئی بحث نہیں کرنی۔ البتہ اگر کوئی سوال زیر بحث آئے گا جو میری رائے کے حوالے سے تنقیح طلب ہوا تو اس وقت ضرور دلائل فراہم کر دوں گا۔

میرے مطالعے کی حد تک پہلے انسان —— حضرت آدم —— کی تخلیق سے متعلق آیات واضح تر معنی میں ارتقا کے مخالف معلومات فراہم کرتی ہیں۔ اس باب میں پہلی آیت وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو حضرت آدم علیہما السلام سے مشابہ قرار دیا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ. (آل عمران ۳:۵۹)	”اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ اللہ نے اُسے مٹی سے بنایا، پھر اُس کو حکم دیا کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔“

یہ آیت بہ صراحت تین باتوں کا ذکر کرتی ہے:

۱۔ تخلیق کرنا: ’خَلَقَهٗ‘۔

۲۔ مٹی سے بنانا: 'مِنْ تُرَابٍ'۔

۳۔ براہ راست کلمۂ کن کے وقوع سے بنانا: 'قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'۔

یہ تینوں باتیں مل کر، اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اپنی تخلیق میں جن امور میں آدم علیہ السلام ہی کے مانند تھے، وہ امور انھیں الٰہ ماننے میں مانع ہیں۔ واضح رہے کہ یہ آیت حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے رد کے مضمون کی حامل ہے۔ حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ بیاہ کے بغیر حضرت مریم کے ہاں، کلمۂ کن کے القا سے آپ پیدا ہوئے تھے، اس لیے آپ کلمۃ اللہ تھے، کلمۃ اللہ ذات الٰہی کا حصہ مانا گیا، نتیجتاً کلمۃ اللہ ہونے کی بنا پر الٰہ مانے گئے تھے۔ قرآن مجید نے اس آیت میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ حضرت عیسیٰ ایسے ہی پیدا ہوئے تھے، مگر وہ الٰہ نہیں تھے۔ وہ اپنی تخلیق میں درج بالا تین امور میں حضرت آدم جیسے ہیں۔

ان تین امور میں بہ طور استدلال یہ نکات قرآن مجید کے پیش نظر ہیں۔ یہ تینوں بلاوجہ بیان نہیں ہوئے:

۱۔ تخلیق: 'خَلَقَهٗ'

o اگر تخلیق نہ ہوتی تو عیسیٰ و آدم مخلوق نہ ہوتے، مخلوق نہ ہوتے تو الٰہ ہونا ثابت ہو جاتا۔[۵]

۲۔ مٹی سے تخلیق (مِنْ تُرَابٍ) یا مریم کے بطن سے پیدایش

o اگر مٹی سے نہ ہوتے تو خاکی مخلوق نہ ہوتے: یہ بات بھی ان کے الٰہ، فرشتہ یا جن ہونے کا تصور پیدا کرتی۔

o حضرت مسیح سیدہ مریم کے بطن[۶] سے پیدا نہ ہوتے تو آپ پھر بنی نوع آدم کے فرد نہ رہتے۔ آل عمران کی نسبت انھیں حاصل نہ ہوتی۔

۳۔ براہ راست کلمۂ کن کا وقوع: 'قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'

o اگر صرف کلمۂ کن سے پیدا ہوتے، یعنی مٹی اور حضرت مریم شامل تخلیق نہ ہوتے تو پھر وہ انسان شمار نہیں ہوتے، بلکہ فرشتے یا روح قرار پاتے۔

o اگر کلمۂ الٰہی کو ذات الٰہی کا جزو سمجھ لیا جائے ـــــ جیسے عیسائی علما نے سمجھا ـــــ تو جزو الٰہی قرار پاتے۔

۵۔ واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی تخلیق ـــــ 'يَخْلُقُ' ـــــ کا لفظ استعمال ہوا ہے: 'قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ' (آل عمران ۳: ۴۷)۔

۶۔ 'وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ' (النساء ۴: ۱۷۱)

o اگر کلمۂ کن کے استعمال سے پیدا نہ ہوتے تو ان کی پیدایش نہ حضرت آدم جیسی ہوتی اور نہ وہ یہ درجہ پاتے کہ وہ کلمۃ اللہ ہیں۔

o ان آیات میں کلمۂ کن کی حقیقت بھی واضح کی گئی ہے کہ وہ ذات الٰہی کا حصہ نہیں، بلکہ تخلیق اشیا کے لیے عمومی حکم الٰہی ہے تاکہ نصاریٰ کے تصور کا مکمل رد کیا جائے۔ معتزلہ نے اسی نکتے کو نہیں سمجھا جس وجہ سے وہ خلق قرآن کے نظریے تک پہنچے۔

نصاریٰ کا نظریہ جو بھی رہا ہو کہ انھوں نے کس وجہ سے حضرت عیسیٰ کو الٰہ مانا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی الوہیت کو رد کرنے کے لیے یہ تین امور بیان کیے ہیں۔

یہ آیت کا استدلال[7] اور اس کے معنی ہیں۔ اب اس استدلال سے آپ سے آپ کچھ چیزیں ثابت ہو رہی ہیں:

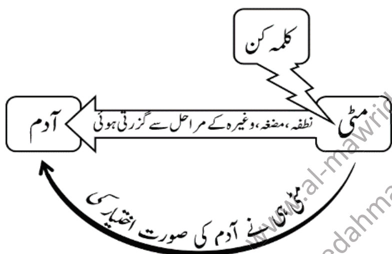

۱۔ حضرت آدم کو تخلیق کرنے کے لیے مٹی کو حکم ہوا کہ وہ آدم میں بدل جائے۔ ریاضیاتی صورت میں یوں لکھا جا سکتا ہے: مٹی + کلمۂ کن = آدم۔

۲۔ اس بات کا لازمی تقاضا ہے کہ آدم کے والدین نہیں تھے، اس لیے کہ مٹی نے کلمۂ کن کے زیر اثر آدم کا روپ اختیار کیا۔[8]

۳۔ حضرت آدم کی ولادت نہیں، تخلیق ہوئی تھی، اس لیے کہ حضرت آدم براہ راست تراب سے بنے۔

۴۔ اگر حضرت آدم ماں باپ کے جنسی تعامل سے پیدا ہوتے تو کلمۂ کن کے اجرا کی ضرورت نہیں تھی۔ جیسے کہ اگر سیدہ مریم کے شوہر ہوتے تو کلمۂ کن کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی قرآن مجید میں مثال

۷۔ استدلال کے ان نکات میں بہت سے قرآنی نصوص میرے پیش نظر ہیں، طوالت کے خوف سے پیش نہیں کر رہا، البتہ میں نے سوچا ہے کہ انبیاے قرآن کے نام سے جو میں المورد کی نصابی کتب تیار کر رہا ہوں، ان میں ان انبیا سے متعلق ان نصوص کو بیان کر دوں گا تاکہ پڑھاتے وقت اساتذہ کے سامنے یہ پہلو موجود رہیں۔

۸۔ یہ بات کہنا غلط ہو گا کہ قرآن مجید میں دکھاؤ کہ کہاں کہا گیا ہے کہ آدم کے ماں باپ نہیں تھے اس لیے کہ بعض باتوں کا التزام و تضمن یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ نتائج مانیں جائیں۔ مثلاً جب کہا گیا کہ مریم پر کلمۂ کن کے القا سے عیسیٰ علیہا السلام پیدا ہوئے تو آپ سے آپ لازم آ گیا کہ آپ کے والد نہیں تھے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

حضرت یحییٰ کی ولادت ہے۔ اس میں انتہائی بوڑھے باپ 'بَلَغۡتُ مِنَ الۡكِبَرِ عِتِيًّا' اور بانجھ ماں 'امۡرَاَتِیۡ عَاقِرًا' (مریم ۱۹: ۸) کے ہاں حضرت یحییٰ کی ولادت میں کلمۂ کن کا ذکر نہیں ہے، حالاں کہ یہ ولادت بھی معجزانہ ہی تھی۔ بالکل ایسے ہی اگر آدم ماں باپ کے توسط سے پیدا ہوتے تو ان کی تخلیق کے لیے کلمۂ کن کی ضرورت نہیں تھی، خواہ یہ والدین حیوان ہوتے یا ناتراشیدہ انسان ہوتے اس لیے کہ یہ پھر ہماری پیدایش کی طرح کا عمل ہوتا۔ ہمارے بارے میں وہ بات نہیں کہی جا سکتی جو حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں کہی گئی ہے کہ اللہ نے کہا کہ ہو جا، تو وہ ہو گئے۔ اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ مٹی اور آدم کے درمیان میں کوئی اور نہیں تھا جو ماں باپ کا کردار ادا کرے۔

لٰہذا یہ آیت چار امور پر دلالت کرتی ہے، جو حضرت آدم کی تخلیق میں بیان ہوئے ہیں۔ ان چاروں کو ماننا لازم ہے۔

چنانچہ، یہ لازم آتا ہے کہ آدم کو براہ راست مٹی سے بننا چاہیے، یہی اس آیت کے الفاظ کا صریح ترین تقاضا ہے۔ اب درمیان میں کوئی ایسا واسطہ ماننا درست نہیں ہے جو براہ راست مٹی سے بننے میں مانع ہو، اس لیے کہ اگر ماں باپ درمیان میں مان لیے جائیں تو ہم میں اور آدم میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ذیل کے خاکے کو دیکھیے اس میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے لحاظ سے آدم علیہ السلام کا مرحلۂ ظہور دکھایا گیا ہے۔ اس صورت میں آدم ہماری طرح ہی پیدا ہوئے، اگرچہ ان کے والدین انسان نہ رہے ہوں، لیکن نہ وہ براہ راست مٹی سے تخلیق ہوئے اور نہ اس تخلیق کے لیے کلمۂ کن کہا گیا اور نہ اس کی ضرورت تھی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

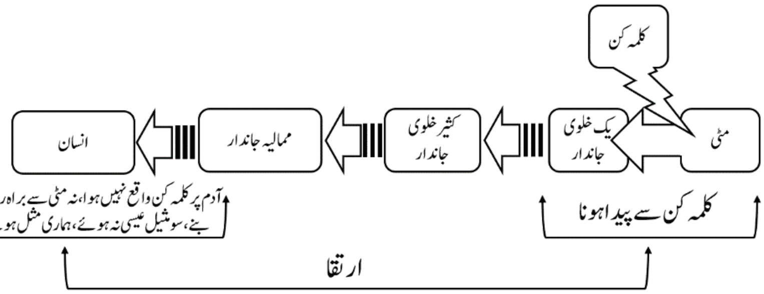

لٰہذا، تخلیق آدم کے کسی ایسے تصور کو نہیں مانا جا سکتا جس میں براہ راست تراب سے کلمۂ کن کے اثر سے آدم کی تخلیق ثابت نہ ہوتی ہو۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت بھی کلمۂ کن سے ہوئی اور حضرت آدم کی تخلیق بھی۔ اگر اوپر بیان کیے گئے نظریے کو مانا جائے تو آدم علیہ السلام کی حضرت عیسیٰ سے کوئی مماثلت نہیں رہتی، اس

صورت میں آدم ہم سے مماثل ہو جاتے ہیں، اور حضرت عیسیٰ اکیلے منفرد جگہ پر کھڑے رہتے ہیں۔

آدم علیہ السلام	عیسیٰ علیہ السلام	وجہ مماثلت و تفاوت
خَلَقَهٗ[9]	يَخْلُقُ[10]	دونوں مخلوق ہیں: بہ ایں فرق کہ آدم بلا ولادت،[11] مسیح بذریعہ ولادت تخلیق ہوئے۔
مِنْ تُرَابٍ	اِلٰى مَرْيَمَ[12]	دونوں محض کلمۂ کن سے نہیں بنے، نہ آدم نہ عیسیٰ، دونوں کو جزوًا اسباب سے بنایا گیا، (یعنی ماں اور مٹی سے): آدم کے لیے مٹی کا ذکر کیا کہ مٹی آدم کی صورت میں ڈھلی، حضرت عیسیٰ کو سیدہ مریم نے جنم دیا، ایک عورت کے ہاں ولادت آپ کو ابن آدم بناتی ہے۔
قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ	دونوں براہ راست کلمۂ کن کے اثر سے بنے، یعنی دونوں کو بنانے کے لیے اسی وقت یہ کلمہ کہا گیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

ہم اور آدم و مسیح

یقیناً سب انسان کلمۂ کن سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن کلمۂ کن براہ راست ہم پر واقع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ ہم نظام تولید کے تحت پیدا ہوئے ہیں (الزمر ۳۹: ۶)، ہمارے لیے کلمۂ کن شاید اربوں سال پہلے صادر ہوا تھا۔ اس لیے سیدنا مسیح کو تو 'كَلِمَةٍ مِّنْهُ' کہا گیا ہے، لیکن ہمیں نہیں۔ مثلاً ذیل کی آیت، کیا یہ ہم آپ پر چسپاں ہو سکتی ہے؟ ہر گز نہیں:

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۙ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ	''جب فرشتوں نے کہا: اے مریم، اللہ تمھیں اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے، اس کا نام مسیح

۹۔ آل عمران ۳: ۵۹۔ 'اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'۔

۱۰۔ آل عمران ۳: ۴۷، 'قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'۔

۱۱۔ واضح رہے کہ ولادت کے لیے جو عمل رحم مادر میں ہوتا ہے، اس کے لیے بھی 'تخلیق' ہی کا لفظ قرآن مجید میں بولا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ زمر (۳۹) کی آیت ۶ میں یوں آیا ہے: 'يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ'۔

۱۲۔ النساء ۴: ۱۷۱۔ 'اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ'۔

عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ. (آل عمران ۳: ۴۵)

عیسیٰ ابن مریم ہو گا۔ جو (بن باپ کے ہونے کے باوجود) دنیا اور آخرت میں عزت دار ہو گا، اور (نیک ہونے کی وجہ سے) مقربین میں سے ہو گا۔‘‘

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ہمیں ’كَلِمَةٍ مِّنْهُ‘ نہیں کہا جا سکتا، حالاں کہ ہم بھی اصلاً کلمۂ کن سے پیدا ہوئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہمارے اوپر کلمۂ کن براہ راست اثر پذیر نہیں ہوا، جیسا حضرت عیسیٰ اور آدم علیہ السلام کی ولادت و تخلیق میں ہوا۔ حضرت عیسیٰ کے ساتھ ہونے والے اس عمل کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ. (النساء ۴: ۱۷۱)

’’مسیح ابن مریم تو بس اللہ کے رسول، کلمۂ الٰہی جو مریم پر القا کیا گیا، اور اس کا روح تھا۔‘‘

یہی عمل حضرت آدم کے معاملے میں مٹی پر کلمۂ کن صادر کر کے کیا گیا:

اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ. (آل عمران ۳: ۵۹)

’’آدم، اسے ہم نے مٹی سے پیدا کیا اور کہا کہ بن جاؤ تو وہ بن گیا۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کلمۂ کن کا براہ راست عمل ہمارے ساتھ نہیں ہوا؛ نہ یہ ہماری ماؤں پر القا ہوا، اور نہ ہماری مٹی پر۔ لہٰذا آدم و مسیح، دونوں کلمات الٰہی کی براہ راست ماں اور مٹی پر اجرا سے تخلیق ہوئے ہیں نہ کہ نظام تناسل سے۔ لہٰذا یہ دونوں باتیں: کلمۂ الٰہی سے تخلیق اور والدین کے بغیر پیدا ہونا، آدم و عیسیٰ علیہما السلام کو ہم سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ اللہ کے پیش نظر آدم کی تخلیق تھی، اس لیے یہ بھی ٹھیک ہو گا کہ مٹی اور حضرت آدم کے درمیان خواہ بیسیوں مخلوقات ہو جائیں، وہ آدم ہی کی تخلیق کہلائے گی۔ اوپر بیان کردہ نکات کا صحیح فہم اس کا امکان باقی نہیں رہنے دیتا۔

مزید یہ بات واضح کرتا چلوں کہ یہاں آدم کا نام لیا گیا کہ آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ اگر نام نہ لیا جاتا اور انسان کہا جاتا تو اس رائے کے ماننے کا امکان تھا۔ مثلاً بغیر ایک نسل کے گزرے آدم علیہ السلام کے گھر ہابیل یا قابیل پیدا ہوئے۔ تو کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عیسیٰ کی مثال ہابیل کے جیسی ہے۔ ظاہر ہے، نہیں کہہ سکتے، حالاں کہ ہابیل اور قابیل کی پیدایش بھی خدا کے پیش نظر تھی۔ جیسے ہی ہم آدم و حوا کے اب وجد مان لیتے ہیں تو یہ جملہ

بولنا ممکن نہیں رہتا کہ عیسیٰ کی مثال آدم کے جیسی ہے۔ پھر آدم کی مثال ہابیل و قابیل سے مختلف نہیں رہتی۔

دوسری آیت

تخلیق نفس واحدہ

نفس واحدہ کی تخلیق بھی پہلے انسان کی تخلیق ہی کی بات ہے۔ ان آیات کو بھی اصولی حیثیت ملے گی، جو نفس واحدہ سے بنی نوع آدم کے پیدا ہونے کی بات کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں یہ بات تین چار مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ ان چاروں مقامات کو ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ ذیل میں آیات سورتوں کی ترتیب کے لحاظ سے لکھی گئی ہیں، اور طوالت سے بچنے کے لیے آیات کے ضروری الفاظ ہی کو اقتباس کیا گیا ہے، واضح رہے کہ آیات کے غیر مذکور الفاظ ان آیات کے تعیین معنی میں مددگار نہیں ہیں کہ ان کے عدم ذکر سے کوئی معنی کا تغیر وجود میں آتا ہو:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً. (النساء۴:۱)

”اے لوگو، اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلائیں۔“

دوسری آیت یہ ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ. (الانعام۶:۹۸)

”وہی ہے جس نے تمھاری ابتدا نفس واحدہ سے کی،[۱۳] پھر (تمھارے لیے) جاے قرار اور جاے سپردگی رکھی۔“

تیسری یوں ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا.

”وہ جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس سے راحت

۱۳۔ پیدا کرنے کے لیے آیت میں 'اَنْشَاَكُمْ' آیا ہے 'انشاء' کے معنی میں 'آغاز' کے مفہوم کا غلبہ ہے۔ ترجمہ میں 'ابتداءً' کے لفظ سے اسی بات کو بیان کیا گیا ہے۔

حاصل کرے۔"[14] (الاعراف ۷:۱۸۹)

چوتھی آیت کے الفاظ یہ ہیں:

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا. (الزمر ۳۹:۶) "اس نے تمھیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔"

نفس واحدہ سے بنی نوع آدم کی تخلیق

مذکورہ بالا آیات میں سب سے مجمل آیت سورۂ انعام کی ہے:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ. (۶:۹۸) "وہی ہے جس نے تمھاری ابتدا نفس واحدہ سے کی، پھر (تمھارے لیے) جاے قرار اور جاے سپردگی رکھی۔"

سورۂ انعام کی یہ آیت گو سب سے مجمل ہے، لیکن اس کے یہ الفاظ: 'اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ' ایک حقیقت کا پتا دیتے ہیں کہ تمام انسان ایک نفس کی اولاد ہیں، دو یا تین کی نہیں۔ اگر یہ بات درست ہو کہ:

۱۔ ہم ان آدم و حوا کی اولاد ہیں جو الگ الگ پیدا ہوئے اور

۲۔ یہ کہ ہماری نسل دو افراد سے شروع ہوئی،

تو پھر اس آیت میں بنی نوع آدم کی تخلیق کا مجمل بیان حقیقت کے خلاف ہو گا، کیونکہ یہ آیت یہ کہہ رہی ہے کہ ہم سب کا آغاز فرد واحد سے ہوا ہے۔ یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ مجمل بیان —— دو الگ الگ ماں باپ ماننے کے باوجود —— صحیح ہے، اس لیے کہ یہ اس طرح کا جملہ ہے، جس طرح تم کہتے ہو کہ "تم ایک ہی آدمی کی اولاد ہو۔" ایسا کہنے سے اماں حوا کی نفی نہیں ہوتی۔ اس استدلال کے جواب میں عرض ہے کہ یہ جملہ اولاد کے ساتھ تو ٹھیک ہے، لیکن 'اَنْشَاَكُمْ' (الانعام ۶:۹۸) کے ساتھ درست نہیں۔ "تم ایک ہی آدمی کی اولاد ہو" اور "تمھارا ایک فرد سے آغاز کیا" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح یہ 'خَلَقَكُمْ' (النساء ۴:۱ وغیرہ) کے ساتھ بھی درست نہیں، یعنی "تم ایک ہی آدمی کی اولاد ہو" اور "تمھیں ایک فرد سے پیدا کیا"

۱۴۔ اس آیت میں اگرچہ آغاز آدم و حوا سے ہوا، لیکن آیت کا غیر مذکور حصہ مشرکین پر منطبق ہوتا ہے، نہ کہ آدم و حوا پر، لیکن آیت کا اوپر اقتباس شدہ حصہ آدم و حوا ہی سے متعلق معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں واضح فرق ہے، اس لیے یہ جملہ کہ ''تم ایک ہی شخص کی اولاد ہو''، ان آیات کے معنی کی تعیین کے لیے بناے استدلال نہیں بن سکتا۔ یہ بات ایک اور پہلو سے بھی سمجھیے کہ اگر اس جملے: ''تم ایک ہی آدمی کی اولاد ہو''، کو تخلیق آدم کے مضمون میں رکھ دیجیے تو اس کا بھی لازمی اقتضا یہی ہو گا کہ انسان ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے ہیں۔

لٰہذا، کسی آیت کی ایسی تفسیر جو ہمیں دو جانوں یا دو افراد سے پیدا کرنے کا تصور دیتی ہو، وہ ان آیات کے خلاف ہوں گی جن میں 'اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ' اور 'خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ' آیا ہے۔

نفس واحدہ سے اس کے جوڑے کی تخلیق

مذکورہ بالا آیات میں سے تخلیق کے اعتبار سے سب سے زیادہ مفصل سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے، اس لیے اسے ہی مرکزی حیثیت دینی ہو گی، کیونکہ یہ بات محتاج دلیل نہیں کہ مجمل کو مفصل کی روشنی میں سمجھا جائے۔

یہ آیت اس وجہ سے مفصل ہے کہ یہ پہلے:

۱۔ نفس واحدہ، پھر

۲۔ اسی سے اس کا جوڑا بنانے اور پھر

۳۔ اس جوڑے سے تمام بنی نوع آدم کو بنانے کی تفصیل کرتی ہے،

جب کہ باقی آیات ان تینوں باتوں کو بیان نہیں کرتیں: کسی میں ایک اور کچھ میں صرف دو باتیں مذکور ہوئی ہیں۔ اب اس آیت کو بغیر کسی خارجی اثر کے سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ میں آیت کے بالکل صریح اور دوٹوک معنی ہی کو صحیح سمجھتا ہوں، اس لیے یہاں بھی میں لسانی مباحث کو پیش نہیں کروں گا، اس لیے کہ مجھے اسے توڑ مروڑ کر پیش ہی نہیں کرنا ہے۔ آیت یوں ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً. (النساء ۴: ۱)	''اے لوگو، اپنے اس رب سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلائیں۔''

اس آیت کے اس جملے 'خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ' اسی طرح اس کے تیسرے جملے کہ 'وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً' کے معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اختلاف صرف اس آیت کے جملے 'وَخَلَقَ مِنْهَا

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

زَوۡجَهَا' میں ہوا ہے۔ ہم نے اپنی راے ترجمے میں واضح کر دی ہے۔

مذکورہ بالا تینوں آیات میں ایسے قرائن واضح طور پر موجود ہیں کہ جو 'وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا' میں "سے پیدا کرنے" کے معنی کی طرف دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً النساء کی پہلی آیت میں دیکھیے: 'خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً'۔ اس کے تمام 'مِنۡ نَّفۡسٍ'، 'مِنۡهَا'، اور 'مِنۡهُمَا' دیکھ لیجیے، ایک ہی محل اور طرز پر آئے ہیں۔ آیت کا واضح رجحان 'ایک سے دوسرے کو پیدا کرنے' کی طرف ہے۔ 'تم سب کو نفس واحدہ سے، اس کے جوڑے کو بھی اسی سے اور پھر تم سب کو ان دونوں سے پیدا کیا' کا مضمون غالب ہے۔ بیچ میں اس کی جنس سے پیدا کرنے کا مفہوم اکھڑا اکھڑا ہے۔

یعنی پہلے جملے 'خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ' میں 'خَلَقَ مِنۡ' ہی کے الفاظ ہیں، وہاں ہم نے "اس سے بنانے" کے معنی لیے ہیں تو اس کے بعد وہ کون سا قرینۂ صارفہ ہے جو 'وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا' میں 'خَلَقَ مِنۡ' کو دوسرے مفہوم پر لے جا رہا ہے۔ دونوں جگہ 'خَلَقَ مِّنۡ نَّفۡسٍ' اور 'خَلَقَ مِنۡهَا'، بالکل یکساں اسلوب اور موقع و محل میں ہیں، بلکہ آگے 'وَبَثَّ مِنۡهُمَا' بھی اسی معنی میں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ 'وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا' کا سیاق و سباق اس کی اجازت نہیں دیتا، اس لیے کہ اس آیت میں 'وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا' کے اس ٹکڑے کے آگے 'وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً' اور پیچھے 'خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ' کے الفاظ درمیان والے جملے 'وَخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا' کے 'مِنۡهَا' کو کسی اور معنی میں لینے کی گنجایش نہیں چھوڑتے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

دوسرے یہ کہ نہ کلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے اور نہ زبان کہ 'وَخَلَقَ مِنۡهَا' میں کوئی محذوف یا مقدر مانا جائے۔ جملہ صریح، صاف اور دوٹوک ہے۔ کسی کلام کو اپنے ظاہر سے پھیرنے کے لیے تین چیزیں ہی موثر ہوتی ہیں: ایک یہ کہ خود متکلم کی زبان کسی چیز کا تقاضا کرے، مثلاً 'بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ' میں خود عربی زبان تقاضا کرتی ہے کہ پہلے کوئی فعل ہونا چاہیے۔[15] دوسرے یہ کہ دوسری زبان میں انتقال کسی بات کا تقاضا کرے مثلاً اسم نکرہ میں ایک، کوئی یا کچھ کا اضافہ کرنا: 'کتابٌ' ایک کتاب، یا مثلاً اسمیہ جملے میں "ہے" کا اضافہ کرنا، مثلاً: 'الکتاب جدید' کتاب نئی ہے۔ تیسرے یہ کہ یقینی مصداق یا دیگر قرآنی نصوص اس بات کا تقاضا کریں۔ مثلاً 'وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا' (الشمس ۹۱: ۳) میں "دن جب سورج کو روشن کرتا ہے" مجاز کا

۱۵۔ 'فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَكُمۡ قف ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ' آل عمران ۳: ۶۱ میں 'وَاَبۡنَآءَكُمۡ' سے پہلے 'وتدعوا أبناءكم' حذف ہو گا۔

اسلوب مانا جائے گا، جو ظاہر کلام کے خلاف ہے۔ لیکن یہاں ظاہر کلام سے پھیرنا ہمارے عمومی مشاہدے کی بنا پر ہے، کیونکہ سورج دن کو روشن کرتا ہے، نہ کہ الٹ۔ نصوص سے مثال یہ ہوگی کہ نفس واحدہ کو آدم کے معنی میں لیا جائے، کیونکہ قطعی نصوص آدم کو پہلا انسان بتاتے ہیں۔

ہم نے یہ تفصیل اس لیے کی کہ ان تینوں میں ایک سبب بھی یہاں موجود نہیں: نہ دیگر نصوص، نہ یقینی مشاہدہ، نہ زبان و بیان کا کوئی تقاضا کہ 'مِنْهَا' سے آگے پیچھے کسی چیز کو حذف ماننے پر مجبور کرے یا الفاظ کو ان کے ظاہر معنی سے پھیرنے کا تقاضا کرے۔[16]

لٰہذا بات واضح ہے کہ ہم سب نفس واحدہ سے بنے ہیں، اسی نفس واحدہ سے اس کا جوڑا بنایا گیا اور پھر ان دونوں سے تمام مرد و عورتیں دنیا میں پھیلائے گئے ہیں۔ اس پر کچھ سوالات آگے زیر بحث آئیں گے، مثلاً 'نفس' بہ معنی جنس یا 'منها' کا 'من' جنس کا 'من' ہے وغیرہ۔

تیسری آیت

نفخ روح

اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ. فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ.(الحجر ۱۵:۲۸-۲۹)

یہ آیت واضح طور پر پہلے انسان کی تخلیق سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ گلی سڑی سیاہ چکنی مٹی سے انسان کی پیدایش کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مجمل آیت ہے، کہ سیاہ مٹی سے تخلیق کیسے ہوئی اس عمل کو سورۂ مومنون[17] کی آیات کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ دونوں مقامات کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھیں تو درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

۱۔ اس آیت میں 'تراب' یا 'طین' کی تفصیل کی گئی ہے کہ وہ گلی سڑی چکنی مٹی تھی؛

۲۔ نطفہ غالباً اسی گلی سڑی مٹی سے بنا؛

۱۶۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ نظریۂ ارتقا اس وقت ایک یقینی علم ہے تو کیا ہم اس آیت کو اس کے مطابق نہیں کر سکتے؟ اگر یہ دعویٰ سچ بھی ہو تو تب بھی نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ پھر یہ بات پہلی آیت کے خلاف ہو جائے گی۔ وہ پہلی آیت جو اس مضمون میں اوپر زیر بحث آ چکی ہے، عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے والی آیت۔

۱۷۔ ۲۳: ۱۴۔ 'ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ'۔

۳۔ نطفہ سے لے کر 'خَلْقًا اٰخَرَ' تک کے تمام مراحل کو 'سَوّٰىهُ' سے بیان کیا گیا ہے؛

۴۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ 'خَلْقًا اٰخَرَ' میں روح پھونکنا مراد ہے تو پھر سورۂ مومنون کی آیت ۱۴ کا مضمون مکمل طور پر 'سَوَّيْتُهٗ' اور 'وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ' کے دو لفظوں میں بیان ہو جائے گا۔

۵۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ آدم کی تکمیل پر روح بھی پھونکی گئی۔

۶۔ پانچویں نکتے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس تخلیق آدم کا آغاز کلمۂ کن سے ہوا (آل عمران ۳: ۵۹)، اس کی تکمیل کلمۂ نفخ روح پر ہوئی، گویا دو دفعہ کلمات الٰہی کا صدور ہوا۔

یہاں پر اصولی آیات پر کلام مکمل ہوا۔ اب ان آیات کو دیکھتے ہیں جو اس موضوع پر ضمنی یا تفصیلی آیات ہیں۔

تفصیلی و ضمنی آیات

یہ وہ آیات ہیں جن میں پہلے انسان کی نہیں، بلکہ انسان کی عمومی تخلیق کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں تین طرح کی آیات کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کو الگ الگ سمجھتے ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پہلی آیت

مٹی سے آغاز تخلیق

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ. ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ. ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ. (السجدہ ۳۲: ۷-۹)[۱۸]

اس آیت کا دروبست کچھ یوں ہے:

اُس نے خوب بنائی جو چیز بھی بنائی: اس نے انسان کو مٹی سے بنانا شروع کیا؛

۱۸۔ یہ وہ آیت ہے جس سے ارتقا یا غیر مسوّیٰ (unfinished)، عاقر (unable to bear offspring)، اور ناتراشیدہ (devoid of humanity) انسانوں کی پیدایش، پھر ان کا تسویہ اور پھر ان میں سے دو نفوس کے چناؤ کا اشتباہ سا پیدا ہوتا ہے۔

(مٹی سے شروع کیا تھا)، پھر اُس کی نسل حقیر پانی کے سلالہ سے جاری کی؛
(مٹی سے شروع کیا تھا)، پھر اس کی تکمیل کر ڈالی؛
اور (مٹی سے شروع کیا تھا) اُس میں اپنی روح پھونکی؛
اور تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے ہیں (اس مقصد سے کہ تم یہ قدرتیں دیکھ کر شکر بجالاؤ، لیکن) تم کم ہی شکر کرتے ہو!۔

یہاں ساری بات یہ بتانے کے لیے کی گئی ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے بنانے میں خوب قدرت حسنہ دکھائی ہے۔ ہر چیز کو بہت عمدگی سے بنایا ہے۔ تو یہاں تخلیق آدم میں جو عمدگی کے پہلو تھے، ان کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے بہترین کام کیا تو اس میں قدرت کار خود بہ خود مقدر ہوتی ہے۔ اس بات کو محکم کرنے کے لیے 'اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ' میں 'خَلَقَ' کا ذکر بہ طور خاص کیا گیا ہے، کیونکہ 'خَلَقَ' کے بغیر بھی یہ معنی تو ادا ہو سکتے تھے کہ اس نے ہر چیز کو عمدہ بنایا، اس لیے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ 'أَحْسَنَ الشيءَ' تو اس کا مطلب 'أجاد صُنعه' (عمدہ کرنا) ہی ہوتا ہے، لیکن کس اعتبار سے عمدہ بنایا وہ واضح نہ ہوتا۔ یہاں واضح کیا گیا ہے کہ تخلیق کے اعتبار سے احسن بنایا۔

سورۂ سجدہ (۳۲) کی یہ آیات قیامت اور دوبارہ جی اٹھنے کے انذار کے لیے بہ طور استدلال آئی ہیں کہ قرآن جس بات پر انذار (آیت ۳) کر رہا ہے، وہ ہو کر رہے گی، کیونکہ یہ دنیا اس خالق نے بنائی ہے جس نے چھ دنوں میں زمین و آسمان بنا ڈالے اور تا حال تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہے، قیامت کے دن نجات کے لیے کوئی شفیع و مشکل کشا نہ ہوگا (آیت ۴)، سارے امور کی تدبیر وہی کر رہا ہے اور ہر چیز اپنے وقت پر ہو گی (آیت ۵)، ہر عمل اور ہر چیز، خواہ چھپی ہو یا عیاں ہو، وہ اسے جانتا ہے (آیت ۶)، وہی احسن الخالقین جس نے مٹی لی اور اسے کیا سے کیا بنا ڈالا (آیت ۷)۔ جس نے حقیر پانی کی بوند سے نسل انسان کو جاری کر دیا، مٹی سے بنایا اور ایسا نہیں ہوا کہ وہ اسے مکمل نہ کر پایا ہو، بلکہ بہترین حالت میں مکمل کر دیا۔ مٹی سے بنایا، مگر لطیف روح کا حمولہ بنا دیا۔[19] ایسے ناممکن کام کرنے والا اسی طرح دوبارہ تمھیں زندہ اٹھائے گا، حساب کتاب لے گا۔ اس نے تمھیں سمجھ دار بنایا

۱۹۔ یہ دراصل لطیف و کثیف کے حیرت انگیز اجتماع کا بیان ہے۔ یہ مٹی میں شعور کے پیدا کیے جانے کا نام ہے، جو محیر العقول امور میں سے ہے۔ ایسی ذات سے کیسے بعید ہے کہ وہ دوبارہ زندہ نہ کر سکے۔ اس کی ہماری زندگیوں میں ایک ادنیٰ مثال کمپیوٹر کی ہے، جس میں سوفٹ ویئر کو لوہے اور پلاسٹک کی چیزوں میں ایسے جوڑا گیا ہے کہ وہ ان کا حصہ بن جاتا ہے۔

ہے کہ اس حقیقت کو سمجھو، لیکن تم اس سمجھ داری سے کم ہی کام لیتے ہو۔ یہی بین السطور بات تھی جسے اگلی آیت میں منکرین کا یہ استہزا یہ جملہ نقل کر کے قرائن فراہم کیے گئے ہیں کہ ''جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے تو کیا پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟'' (السجدہ ۳۲: ۱۰)۔

اسی بات کی طرف اشارہ اس جملہ میں بھی تھا کہ 'قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ' (آیت ۹)۔ یہاں تخلیق کے ایسے مظاہر بتائے گئے جو تخلیق کے ناممکن و مستبعد پہلوؤں کو بتائیں اور اس کے ساتھ انسانی افئدہ کو جوڑ کر آخرت کا شعور پیدا کریں۔ وہ ناممکن پہلو یہ تھے: مردہ مٹی سے زندہ مخلوقات، بالخصوص انسان کی تخلیق، حقیر پانی کی بوند سے نسل کا آغاز، مٹی سے جیتی جاگتی مخلوق کی تکمیل اور اس کا روح جیسی لطیف شے کا حمولہ ہونا۔ اس میں 'بدا' کو جس زاویے سے استعمال کیا گیا، وہ حیات بعد الموت کے استبعاد (improbability) کو رفع کرنا تھا۔ رفع استبعاد کے لیے استدلال یہ بنا کہ اگر مٹی سے تم بن سکتے ہو اور حقیر پانی سے بن سکتے ہو تو کیا گل سڑ جانے کے بعد نہیں بنائے جا سکو گے؟ اس صورت میں بھی تو مٹی ہی سے بننا ہے نا؟ رہ گیا زندگی اور شعور تو وہ اسی مٹی اور حقیر پانی سے بنے انسان میں نفخ روح ہوئی تھی نا؟ تو اب کیا بعید ہے کہ دوبارہ ایسا ہو جائے۔ ایسے ہی گلی سڑی ہڈیوں سے جیتا جاگتا انسان بنانا بھی کیا مشکل ہوگا، اس لیے کہ پہلے بھی مٹی سے مکمل انسان بنایا گیا ہے۔ ایک اور آیت میں یہ تمام مضمون اس طرح بھی بیان ہوا ہے:

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى. ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى. فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى. اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى. (القیامہ ۷۵: ۳۷-۴۰)

یہ آیت اس مضمون کی حامل تھی۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ یہاں 'مَآءٍ مَّهِيْنٍ' کے الفاظ بولے گئے ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مضمون مراحل بتانے کا نہیں، بلکہ حقیر چیز سے انسان جیسی مشکل مخلوق پیدا کرنے کے محال امر کا بیان ہے۔ اگر مراحل بیان کرنا پیش نظر ہوتے تو 'نطفہ' کا لفظ زیادہ موزوں تھا۔ اگرچہ نطفہ بھی حقیر چیز ہے، لیکن حقیر ہونا اس کا لازمہ نہیں ہے۔

آیات کے اس محل کے واضح ہونے کے بعد 'بدأ' اور 'ثُمّ' کا تعلق بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ 'ثُمّ' ترتیب کے لیے نہیں، بلکہ مٹی اور حقیر پانی سے بنائے جانے کے استبعاد کے لیے آیا ہے، یعنی مٹی سے شروع کیا، پھر نسل کشی شروع کر دی، مٹی سے شروع کیا تو پھر مشکل ترین کام کی تکمیل کر ڈالی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ دونوں 'ثم' ترتیب کے لیے نہیں بلکہ 'بدأ' کے جواب کے محل میں ہیں، یعنی شروع کیا تو پھر کیا ہوا؟

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مٹی سے انسان بنانا شروع کیا	پھر نسل اسی کے نطفے سے جاری کر دی
مٹی سے انسان بنانا شروع کیا	پھر تسویہ کر کے روح پھونک دی

میری راے کے حق میں قرائن میں ایک قرینہ آیت ۸ میں بھی ہے۔اس آیت پر ایک نگاہ دوبارہ ڈالیے اور دیکھیے کہ یہ اپنی ساخت کی وجہ سے مرحلہ ہونے سے ابا کرتی ہے: 'ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ'، یعنی یہ بات نہیں کہی گئی کہ پھر ہم نے اس انسان کو اولاد جننے والا بنایا، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کی نسل پانی سے جاری کی۔اگر 'ثم جعله ما یَلِد' جیسے الفاظ میں بات بیان ہوتی تو بلاشبہ اگلا مرحلہ قرار دیا جاتا، یعنی جو وجود بنایا جا رہا، اس میں کسی تبدیلی کا ذکر ہی نہیں ہوا کہ اسے مرحلہ مانیں۔مثلاً اسی آیت کے اس جملے: 'ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ' مرحلہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیر تخلیق چیز میں تبدیلی کا ذکر کرتا ہے۔سورۂ سجدہ کا یہ اسلوب وہی ہے جو درج ذیل آیت میں استعمال ہوا ہے، یعنی محال بات ایک چیز سے پیدا کر لی گئی:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا.

"اور وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اُس کے نسب اور سسرال ٹھیرائے۔تیرا رب بڑی قدرت والا ہے۔" (الفرقان ۲۵: ۵۴)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سورۂ سجدہ کی آیت ۹ کا یہ جملہ بھی مرحلہ ہونے کی طرز پر بیان نہیں ہوا: 'وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ'۔اس کو اگر مرحلہ مان لیں تو آیت کا سارا مضمون ہی غارت ہو جاتا ہے۔اس جملے کا مقصود یہ ہے کہ میں نے تمھیں مٹی سے بنایا، پھر نسل پانی سے جاری کی، اور پھر بے عیب تکمیل کر ڈالی، اس سب کچھ کو سمجھنے کے لیے تمھیں سمع و بصر دیے۔اس کا محل یہ ہے۔اس کا محل بیان مرحلہ کا نہیں، کیونکہ نہ اس میں 'ثم' ہے نہ 'فاء' ہے۔اس کے حق میں قرائن میں خطاب میں تنوع آنا[20] اور 'قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ' کا جملہ ہے کہ سامعین کو مخاطب کر لیا گیا ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ 'وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ' کے الفاظ سے قریش مخاطب کر لیے گئے ہیں اور انسان کی تخلیق کا ذکر پہلے ہی مکمل ہو گیا ہے۔نفخ روح پر اس کی تخلیق اور تخلیق کے کمالات کا بیان تمام ہوا۔یہ جملہ واؤ سے عطف کیا گیا ہے، ضمیر مخاطب جمع کی کر دی گئی ہے۔مراد یہ ہے کہ میں نے یہ سارا کچھ بنایا اور اس کے ساتھ تمھیں سمیع و بصیر بنایا کہ تم ان باتوں

۲۰۔ یعنی واحد غائب کے صیغے (third-person) سے 'لکم' جمع مخاطب (Second-person) کی طرف کلام پھر گیا ہے۔

کو سمجھو۔ اور اپنے خدا کو پہچان کر شکر گزار بنو۔

'ثُمَّ سَوّٰىهُ'[21] ... بیان مراحل ہی کے اسلوب میں ہے۔ لیکن یہ جامع مرحلہ ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات کے موازنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نطفہ، علقہ و مضغہ وغیرہ سے ہوتے ہوئے مکمل انسان بننے تک کے سارے مرحلے کو ہم تسویہ والے دور میں شامل کر سکتے ہیں (دیکھیے ذیل میں الحجر کی آیات ۲۸ اور ۲۹)۔ تسویہ نک سک سے درست کرنے کے معنی میں بھی آسکتا ہے، لیکن زیادہ تر یہ شان دار متوازن تکمیل کے معنی ادا کرتا ہے۔ مثلاً 'اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ. فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ' (الحجر ۱۵: ۲۸-۲۹)۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں 'علقة' وغیرہ کا ذکر ہوا ہے، وہاں تسویہ کا ذکر نہیں ہوا، اور جہاں تسویہ کا ذکر ہوا ہے، وہاں 'علقة' وغیرہ کا ذکر نہیں ہوا۔ اسی لیے قرآن مجید میں

۲۱۔ 'ثُمَّ سَوّٰىهُ' میں 'سوّٰی' کو 'نک سک سے درست کرنے'، یعنی 'نوک پلک سنوارنا' کے معنی میں لیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربیت کی رو سے 'سَوّٰىهُ' کا یہ مطلب ہو سکتا ہے، لیکن یہ اس کا مستعمل معنی نہیں ہے۔ اکثر مفسرین اس لفظ کو سنوارنے سے تجرید دے ہی نہیں سکے، حالاں کہ مستعمل زبان میں یہ 'بنا دینے'، یعنی 'مکمل کر دینے' کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً سورۂ اعلیٰ (۸۷) میں ہے: 'اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى'، یعنی اس نے نقشہ بنایا اور اس نقشے کے مطابق بنا دیا۔ 'ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا' (الکہف ۱۸: ۳۷)، یعنی پھر اس نے تمھیں آدمی بنا ڈالا۔ یا مثلاً 'فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ' (الحجر ۱۵: ۲۹)، یعنی میں نے مٹی سے انسان بنانے کا ارادہ کیا ہے۔ جب میں بنا چکوں اور روح پھونک لوں تو تم اس کو سجدہ کرنا۔ یا مثلاً: 'ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ'، یعنی پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو سات آسمان بنا ڈالے۔ یہیں سے یہ پورا بنا دیا گیا ہو، درمیانی مراحل میں نہ ہو یا بنانے کا کوئی پہلو رہ نہ گیا، یعنی 'بالکل ٹھیک اور صحیح صحیح بنا دیا گیا ہو' کا مفہوم دیتا ہے۔ مثلاً 'فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا' (مریم ۱۹: ۱۷) اور اس کے اسی مفہوم سے 'سویا' ''صحیح سالم'' کے مفہوم میں آتا ہے۔ مثلاً 'ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا' (مریم ۱۹: ۱۰)، یعنی اے زکریا، تم تین دن رات بات نہیں کر سکو گے، جب کہ تم صحیح سالم ہو گے۔

''معجم الوسیط'' میں 'سَوّٰی' کے اس مفہوم کو یوں بیان کیا گیا ہے: 'سوّى الشّيءَ: اتمّه، فَإِذَا سَوَّيتُه وَنَفَخْتُ فِيه مِنْ رُوحِي' ('سوی الشيء' کا مطلب ہو گا: مکمل کر دینا، جیسا کہ اس آیت میں ہے: 'فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ')۔ ''معجم کلمات القرآن'' میں یوں ہے: 'سوّى الشّيءَ: عمله'۔ 'سوی الشيء' کا مطلب ہے: ''چیز کو کر گزرنا''۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

تسویہ ایک مقام پر 'عَدَلَ' (متوازن کرنے) سے پہلے آیا ہے: 'الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ. فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ' (الانفطار ۸۲: ۷-۸)، یعنی یہاں تسویہ میں نک سک سے درست کرنے کے معنی نہیں ہیں، محض بنا دینے کے معنی ہیں۔ میرے خیال میں ان آیات کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے: جس نے تجھے بنانے کا فیصلہ کیا، پھر بنا ڈالا، تو تجھے بالکل متوازن بنایا، اِس طرح کہ جس صورت میں چاہا، تیری صورت گری کر دی۔

ان آیات کی روشنی میں آپ یہ بھی جان سکتے ہیں کہ 'ثُمَّ سَوّٰىهُ' کا موقع ورود بھی اسی بات کو ثابت کرتا ہے۔ الانفطار کی محولہ بالا آیات ۷-۸، اور الحجر کی محولہ بالا آیات ۲۸-۲۹ میں خلق اور تسویہ کا جو تعلق ہے، وہی السجدہ کی زیر بحث آیت ۷ میں ہے۔ ان سب آیات میں تسویہ خلق کے بعد آیا ہے، یعنی خلق کے معنی بنانے کے ہیں اور تسویہ تکمیل کا نام ہے، اور 'فَعَدَلَكَ' اس کے بعد مذکور ہے۔ ممکن ہے، 'فَعَدَلَكَ' روح پھونکنے سے ہوتا ہو (الحجر اور الانفطار محولہ بالا آیات کا مجموعی مفہوم، یہ بات محض قیاس ہے)۔

اس روشنی میں آپ جان سکتے ہیں کہ خلق آدم کے مراحل حیات کا بیان آیت کے لفظوں میں موجود نہیں ہے، اس لیے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مٹی سے بننے اور آدم کے درمیان میں کوئی غیر مسوّیٰ انسانی نسلیں یا مخلوقات (species) پیدا ہوئی ہیں۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org